علامہ اقبال سے منسوب اشعار: تحقیقی جائزہ

(Verses Attributed to Allama Iqbal: A Research Study)

DOI: https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2022.06031823

ڈاکٹر محمد عامر اقبال
Dr. Muhammad Amir Iqbal
Assistant Professor, Department of Urdu,
University of Sialkot, Sialkot.

ڈاکٹر مشتاق عادل
Dr. Mushtaq Adil
Chairperson, Department of Urdu,
University of Sialkot, Sialkot.

Abstract:

Poets are considered the most sensitive individuals of society. They present their feelings in the form of poetry. Urdu literature is very rich in terms of having distinguished writers, poets, researchers and critics. Allama Iqbal has a prominent place in Urdu literature. He used the genre of purposeful poetry to express his inner feeling. His poems adorned with intellectual and artistic qualities are revolutionary as well. These poems are presented as examples and references at every forum. In modern times, some poems have been attributed to Iqbal which are not his creation. This is not the result of any conspiracy but just due to lack of research and deep study. Whatever that matches with the poetic style of Iqbal is usually attributed to him without any research as just a little research saves a lot of misleading results. This article highlights the merits of Urdu poetry and presents analysis of the poems wrongly attributed to Allama Iqbal.

Keywords:

Allama Iqbal, Attributed Poetry, Urdu Poetry, Urdu Poems, Urdu Literature.

شعر کہنا دراصل الفاظ کی لہروں میں سہو بھرنا ہے۔ قافیہ پیمائی اور ردیف سازی سے بیت خوانی کا فن تو حاصل ہو جاتا ہے مگر تاثیر نہیں پاتا۔ شعر طرازی سے محفلوں کو گرمایا جاتا ہے۔ واہ واہ، مکرر مکرر، کیا خوب، سبحان اللہ اور کیا بلند شعر ہے کا نعرہ مستانہ محفلوں کو گرماتا ہے۔ شاعر خوشی سے بھولا نہیں سماتا اور تحسین کے سیلاب میں بہتا چلا جاتا ہے۔ اگر شعر کی اہمیت، عظمت، تاثیر اور اس میں پوشیدہ رنج والم کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جب بھی کوئی اچھا شعر سنو تو سمجھو کہ کہیں کوئی عیسیٰ مصلوب ہوا۔

الفاظ میں کرب کی تاثیر ہو تو طاقت پرواز کی صفت مہمیز کا کام کرتی ہے اور بات دوسروں کے دل تک اثر کرتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے شعرا کرام نے اپنے ناکام عشق کو غم والم کی داستان نہ بنایا۔ یہ شعرا کرام کا اسلوبیاتی فن ہے کہ انہوں نے محبت اور حقیقت کے حسین امتزاج سے اپنی داستان کو بھی ترانہ ملی بنا کر زبان زدِ عام بنا دیا کچھ لوگ شاعری کو کتھارس کا عمل سمجھتے ہیں اور بعض ایسے وقت کا ضیاع، ثانی الذکر افراد مختلف حیلے بہانوں سے شاعری کے خلاف رقم طراز بھی نظر آتے ہیں جو مضحکہ خیز ہو کر محض ظریفانہ تحریر کے طور پر لوگوں کی مسکراہٹ کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ شعرا کرام کی دل آزاری کا موجب بھی بنتے ہیں۔ شاعر تو حالات اور واقعات کو چشم نرگس سے دیکھ کر اپنے دل رنجیدہ میں بسا لیتے ہیں اور پھر نوک قلم سے اسے الفاظ کا پیرہن دے کر کاغذ پر نقش کر دیتے ہیں۔ یہی نقش شوخی تحریر بن کر آہ وفغاں کرنا ہے۔ بعض اوقات یہ نالہ وفریاد آسمان کی وسعتوں کو چھو لیتی ہے۔ نفسا نفسی کے عالم میں کس کو فرصت ہے کہ مر جائیں تو بخشش کے دو بول ہی بولے۔ چھینا چھینی کے اس عالم میں شاعر یہ چیخ اٹھتا ہے کہ اپنے قل اور اپنا چہلم اپنے ہاتھوں کر جائیں۔ آج الفت کا بھی کال پڑا ہے۔ نفرت کا جنجال بڑا ہے۔ صرف شاعر حضرات ہی ہیں جو دہلیز وقت پر جذبات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے، محبت، رواداری، انسانیت اور اخلاقیات کی راہ سمجھا رہے ہیں۔ یہ شاعر حضرات ہی ہیں جو زمانے کی کج ادائیوں اور واقعات کی رونمائیوں کو محسوس کر کے الفاظ کے حریری پردوں میں بیان کرتے ہیں اور مظلوم کو کاغذی پیرہن میں لپیٹ کر ظالم کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں ان کے من میں جلتی ہوئی چنگاری کلام موزوں بنتی ہے اور شعر کی صورت میں زبان پر آتی ہے۔ یہ صاحبان بصیرت مقلّدِ بے بسر نہیں ہوتے اور نہ ہی دقیق فلسفیانہ مضامین میں الجھ کر زندگی کی رعنائیوں سے بے بہرہ ہوتے ہیں بلکہ یہ الجھی ہوئی لٹ دیکھتے ہیں تو سلجھانے کی ادا بھی بتاتے ہیں۔ چھاپ تلک چھن جانے پر شکوہ کرتے ہیں تو پریم بھٹی کا مدھوا پلا کر متوالا کرنے کا انداز بھی سمجھاتے ہیں۔ راکبِ تقدیر جہاں بن کر اسپ عمر کو اپنی منشا کے مطابق اجازت خرام دیتے ہیں۔ شاعر تو کفن کے گھونگھٹ اور لاش کو دلہن بنا کر کسی کی موت کو پیار کا بندھن بھی قرار دیتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ دل پر بہت گہری چوٹ کھا کر چہرے پر قہقہہ نمودار ہوتا ہے۔ یہی شعراء کرام برگِ خزاں رسیدہ کو بہار کی رنگینیوں پر آنسو بہاتا دیکھتے ہیں اور اس آہ وزاری اور نالہ وشیون کو آسمان تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ جنوں کی حکایات خونچکاں بھی لکھتے ہیں۔ چلیں تو جاں سے گزرنے اور رکیں تو کوہ گراں ثابت ہونے کا عندیہ دیتے ہیں۔

ان تمام باتوں پر غور کیا جائے تو یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ شاعری پاکیزہ جذبات کی عکاسی کرتی ہے اگر شاعری صفلی جذبات کو ابھار کر کسی برائی کی طرف راغب کرے یا انسان کے منفی رجحانات کی تقویت کا باعث بنے تو ایسی شاعری بدروح کی غذا کہلائے گی اس کا نہ تو دنیا کے کسی ادب سے کوئی واسطہ ہو گا اور نہ ہی اخلاقیات سے کوئی تعلق، اگر اساتذہ کی شاعری پر غور کریں اس میں معاشرتی مصائب و آلام کے ہوں گے یا روزگار کے۔ غم جاناں ہو یا نالہ زماں

غرضیکہ ہر دکھ اپنی ہی ذات کا نوحہ محسوس ہوتا ہے قدیم اساتذہ کی شاعری پر ابن انشاء نے کیا خوب کہا ہے:

اللہ کرے میر کا جنت میں مکاں ہو
مرحوم نے ہر بات ہماری ہی بیاں کی

اور پھر میرؔ تو کہتے ہی یہ تھے:

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
برسوں رہیں گی یاد یہ باتاں ہماریاں

علاوہ ازیں مزاحیہ شاعری کو ہی لیجئے۔ کون ہے جو اس کی شہرت اور تاثر سے انکار کرتا ہے۔ بعض اوقات مزاحیہ شاعری میں ایسے موضوعات مثبت انداز میں بیان کئے جاتے ہیں جن پر کھلے منہ بات نہیں کی جاسکتی۔ مزید یہ کہ اگر اخلاقی اور انقلابی کا جائزہ لیں تو ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ حالی اور اقبال کو شاعری کے میدان میں بدطولیٰ حاصل تھا۔ ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ شاعری تو پاکیزہ جذبات کی عکاسی، دکھی دل کی فریاد اور محبت کا اظہار ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے کا حساس ترین فرد شاعر ہی ہوتا ہے اور یہ احساس اس کی طبیعت کا جزو لاینفک ہوتا ہے یہ کہ ملمع کاری۔

ان صفات کے حامل شعرا نے رفعتیں پائیں۔ میر تقی میرؔ جیسے خدائے سخن نے شاعری کے دریا بہادیے۔ جس نے بھی اس استاد الشعراء کی زبانی شعر سنے وہ میرؔ کی طبیعت کی روانی کا دل دادہ ہو گیا۔ وہ قشقہ کھینچنے والا، دیر میں بیٹھنے والا، ترک اسلام کرنے والا۔ بانکوں، ٹیڑھوں، ترکھوں اور ترچھوں، سب کا ہی امام ٹھہرا۔ سارے رند اور اوباش اس کے سامنے سجود میں رہتے تھے۔ یہ ہے شاعری کے فکر و فن کا مقام محمود جو شاعری کا معیار اور منہاج ٹھہرا۔ میر تقی میرؔ کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں:

> "کبھی وہ ہمیں غم زدہ کر دیتا ہے، کبھی وہ ہمارے غموں کا تزکیہ کرتا ہے، کبھی وہ ایسی سچائی کا شعور ہمیں دیتا ہے جس سے شاید ہم واقف تو تھے لیکن اس طرح نہیں جس طرح میر نے ہمیں واقف کرایا ہے کبھی ہم اس سے اکتا جاتے ہیں لیکن ان سب کیفیات کے ساتھ میر کے شعر ہمارے ذہن کو اپنی گرفت میں لے کر ہمیں بدلتے رہتے ہیں۔"(۱)

شاعری کی راہ پر چلنے والے اپنا دامن بچا کر اردو زبان و ادب کے لیے چراغ ثابت ہوتے ہیں۔ اور چراغ کا کام ہے روشنی دکھانا، شعرا کرام کا طریق یہی رہا ہے، جس کے جی میں آئے وہ ان سے روشنی پاتا ہے۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ نے اپنے محبوب کو نہ جانے کس رنگ میں دیکھا، ان کا جو حال تھا وہ ویسا نہ تھا۔ مگر سوداؔ نے قصیدہ نگاری میں جس کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اس صنف میں جو شہرت سوداؔ کو ملی وہ کسی دوسرے نہ ہو سکی۔ انہیں قصیدہ نگاروں

کا امام کہنا ہی انہیں خراج تحسین پیش کرنا ہے۔ آپ جیسے شعرا کرام اردو زبان ادب کی پہچان ہیں۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ کے بارے میں کہا جاتا ہے:

"سوداؔ اردو زبان و ادب کی قد آور، توانا اور کثیر الجہت شخصیت تھے۔ وہ ہر صنف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ الہام کے تدارک اور ہند ایرانی کلچر کے فروغ میں ان کی خدمات گراں قدر ہیں انہوں نے اردو کی غرابت دور کی اور ان گنت نئی ترکیبیں وضع کیں۔ ان کے زور طبع سے دو زبانیں ترتیب پا کر تیسری زبان پیدا ہو گئی۔ انہوں نے اردو غزل کو جلال، قصیدے کو وجاہت اور مرثیے کو تنوع عطا کیا۔"(۲)

ایسے شاعر بھی موجود ہیں جو نسل در نسل شبیر کی مدح سرائی کرتے ہیں اور ان کی نسلیں اردو زبان و ادب پر احسان کرتی ہیں۔ مرثیہ کی صنف ان سے منسوب ہو کر آسمان کی بلندیوں کو چھو لیتی ہے۔ روایات بتاتی ہیں:

"میر انیس نے معتقدات کو سیرت امام سے اجاگر کیا اور جذبات انسانی کو شعر کی صداقت کا آئینہ بنا دیا۔"(۳)

شاعری کے وسیع میدان میں شعرا کرام نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ نئے تجربات ہوئے، نظم اور غزل نے کئی رنگ اختیار کیے۔ ذلف گرہ گیر کی طوالت کے مزے لیے جانے لگے۔ قد و قامت کے بیان میں سننے والوں کی آہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ عطش عطش کی پکار نے محفلوں کو گرمایا۔ کسی کو اٹکھیلیاں سوجھیں تو کوئی بیزار ہوا۔ پھر وہ دور آیا کہ اس روایت سے بغاوت ہو گئی۔ اعلیٰ ترین شعراء نے شاعری میں فلسفہ کو فروغ دے کر اردو شاعری کا قبلہ بدل دیا۔ خیالات میں آنے والے مضامین پر غیب کا اعلان کر دیا گیا۔ مدیر خامہ کو نوائے سروش کا درجہ ملا۔ میکدے کے دروازے پر کھڑے واعظ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جناب شیخ کی نصیحتوں پر طنز ہونے لگا۔ کفر و ایماں کے درمیان الجھا ہوا شاعر پیچھے کلیسا کو پاتا تو آگے کعبے کو سرزنش کے لیے تیار دیکھ کر دبک جاتا۔ موت کا دن معین ہونے کے باوجود رات بھر نیند نہ آنا شاعر کی طبیعت میں رکاوٹ پیدا کرتا تو یہ بھی "رواں اور" ہونے کا باعث قرار پایا۔ شاہ کے مصاحبوں پر اتراتے ہوئے پھرنے کی پھبتی نے ماحول کو گرما دیا۔ شاعری میں اس بے مثال تبدیلی کا سہرا غالبؔ کے سر باندھا گیا۔ شاعری کے مفاہیم میں غزل نے نئی روایت کی بنیاد رکھی۔ اقبال کی غالب شناسی کا ذکر پروفیسر عبدالحق نے اس انداز سے کیا ہے:

"غالب کے قرب کی قندیل سے اقبال نے اپنی گزرگاہ خیال کو ہمیشہ فروزاں رکھا جو شہر آرزو کی عظمت رفتہ کے ماتم خانے میں بھی شمع بن کر روشنی بکھیرتا رہا۔"(۴)

فکر اقبال میں غالب شناسی کے پہلو بہت ہی عمدہ تاثر پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے غالب کی عظمت اور

برتری کا جادو سر چڑھ کر بولتا سنائی دیتا ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے اقبال کی غالب شناسی کے ذکر میں یہ بھی کہا ہے:

"غالب کو اب تک فارسی شعراء کا ہم دوش بنایا گیا تھا مگر اقبال نے گلشن ویمر میں خوابیدہ گوئٹے کا ہم نشیں قرار دے کر غالبؔ کو آفاقی حدود تک لے جانے میں سبقت لی ہے۔"(۵)

پیشہ آیا سپہ گری تھا اس لیے اپنے لیے شاعری کو ذریعہ عزت قرار دنہ دیتے تھے۔ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز اس شاعر نے عوام کی سوچ کا دھارا بدل دیا اور مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جہاں جسم جلا ہے وہاں دل بھی جل گیا ہو گا۔ اب کیا جستجو ہے جو راکھ کر دیتے ہو۔

غالب کے بعد حالی کی بے نیازی اور سادہ دلی نے شاعری میں اجتہادی موضوعات کی بنیاد رکھی۔ شاعری کو قومی اور ملی افق سے روشناس کرایا۔ روایتی انداز گفتار اختیار کرتے ہوئے پہلے تو فرضی محبوب بنایا۔ اس زمانے میں شاعروں کی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی۔ خیالی محبوب کی چاہ میں دشتِ جنوں کی خاک اڑاتے پھرتے۔ اس معاملہ میں قیس اور فرہاد کی مثال سامنے رکھتے اور انہیں بھی گرد کر دیتے۔ چشمِ دریا بار سے عالم کو ڈبو دیتے۔ آہ وفغاں کے شور سے کروبیوں کے کان بہرے کر دیتے۔ شکایتوں کی بوچھاڑ کرتے۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان کو چھلنی کر دیتے۔ رشک میں ساری خدائی کو رقیب سمجھتے۔ محبوب کی تیغِ ابرو سے شہید ہوتے۔

بادہ نوشی پر آتے تو خم کے خم اڑاتے اور بہشت کی سیر کرتے۔ حالی بھی شاعری کے اس انداز سے لطف اندوز ہوئے جو گلی گلی رواں دواں تھا۔ پھر طبیعت کے رجحان نے مزاج میں ایسی تبدیلی پیدا کی کہ مدوجذر اسلام کی شکل میں قوم کو پڑھنے اور سوچنے پر مجبور کر دیا۔ خاصائے خاصانِ رسل ﷺ کے سامنے فریاد کرتے ہوئے کہا کہ تیری امت پہ عجب وقت آن پڑا ہے۔ حالی نے شاعری میں بے مثال تجربے کیے اور اسے قومی اور ملی راہوں پر گامزن کیا۔ یہ انقلابی قدم صرف وہ اٹھا سکتا ہے جس کے دل میں ملت کا درد پوشیدہ ہو۔ صرف شعر کہہ دینے سے بات نہیں بنتی بلکہ اس کے لیے وہ سوز جگر درکار ہے جو لہو کا قطرہ بن کر الفاظ کی شکل میں عیاں ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالحق اپنے مضامین میں حالیؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"غزل کے خاک و خمیر میں حالی نے نیا خون رواں کیا۔ فرسودہ اور روایتی موضوعات سے انحراف کا اعلانیہ جاری کیا اور مثالی نمونے پیش کیے۔"(۶)

مرزا خان داغ نے زندگی میں ہی جو شہرت پائی وہ کسی دوسرے کے نصیب میں کم ہی آئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب طوائف، کوٹھ اور غزل گوئی، شہرت کے ارکانِ خمسہ میں شمار ہوتے تھے۔ مرزا خان داغ بھی غزل لکھتے کاغذ کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے ہی غزل طوائف کے ہاں بھیج دی جاتی۔ اس طرح کوٹھ بہ کوٹھ، سینہ بہ سینہ، زینہ بہ زینہ اور

حسینہ بہ حسینہ ان کی غزل مشہور ہوئی اور داغ کو بھی مشہور کر گئی۔ داغ کی شاعری میں روز مرہ اور محاورہ کی شاندار مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں کہا جاتا ہے:

"شاعری کے تیور ان کی زبان ہی سے بنے ہیں۔"(۷)

اقبال نے سیال کوٹ کی سرزمین پر جنم لیا۔ وہاں ایف اے تک تعلیم حاصل کی اور پھر لاہور آکر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ لاہور کے مشاعروں میں شرکت شروع کی۔ دبستان لکھنؤ اور دبستان دلی سے برات کا اعلان کرتے ہوئے خم زلف کمال کا اسیر ہونے کا پیغام سنایا۔ جب کہا کہ میرے عرق انفعال کے قطرے شانِ کریمیؐ نے موتی سمجھ کر چن لیے تو ارشد گورگانی جیسا بلند پایہ شاعر جو اس محفل کی روح رواں تھا، بے تاب ہو کر اقبال کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا۔

انجمن حمایت اسلام کے جلسے شروع ہوئے اقبال کی نظمیں سامنے آنے لگیں۔ اقبال نے نظم "نالہ یتیم" پڑھی تو اردو زبان و ادب کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ انیس و بیر کے مرثیوں میں بھی یہ بات نہیں جو اقبال کی اس نظم میں ہے۔ اقبال نے ہر صنف میں جوہر آزمائی کی اور شاعری کا حسین محل تعمیر کیا۔ فطرت کی شاعری میں اپنا انفرادی رنگ اپنایا۔ آپ فطرت کو بت بنا کر پیش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کہ کہیں لوگ اس کی پرستش ہی شروع نہ کر دیں۔ یہ بھی کہیں بت ہی نہ بن جائے۔ اس لیے فطرت پرستی کی حدود کا بھی تعین فرمایا۔ اقبال کے نزدیک پرستش کا لفظ کسی بھی طرح درست نہ تھا۔ آپ حب الوطنی کے تو قائل تھے مگر وطن پرستی کو آپ بت پرستی ہی سمجھتے تھے۔ اس لیے آپ نے عوام کو ہر معاملہ میں ایک خاص انداز اختیار کرنے کی ہدایت دی۔

آپ نے قصیدہ نگاری کی صنف میں بھی طبع آزمائی فرمائی اور اس میں بھی کوئی طمع، لالچ، خواہش اور تمنا کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ اقبال نے مرثیے بھی کہے اور اس میں بھی انقلابی اور اجتہادی موضوعات متعارف کرائے۔ قومی اور ملی شاعری میں قوم اور مذہب کے ساتھ ساتھ تعلیم، تربیت، سیاسیات غرضیکہ ضرورت کے تمام موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ آپ نے غالب فہمی کی حدود کا دائرہ مغرب تک وسیع کیا اور گلشن ویمر میں آرامیدہ کو غالب کا ہم نوا قرار دے کر یورپ میں غالب شناسی کی بنیاد رکھی۔ قومی اور ملی شاعری میں حالی اقبال کے پیش رو ثابت ہوئے اور مرزا خاں داغ وہ استاد تھے جو اقبال کی ابتدائی غزلیات سے بھی متاثر ہو گئے۔ مولوی میر حسن وہ استاد تھے جو زندگی کے ابتدائی دور میں ہی اقبال کی تربیت پر اثر انداز ہوئے اور اقبال گر بن گئے۔

ان تمام شخصیات کا اثر اقبال کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر بھی آتا ہے۔ ہر شعر اپنے اندر الفاظ اور معانی کا جہان لیے ہوئے ہے۔ شعر سننا، پڑھنا اور اسے سمجھنا بھی کسی خوبی سے کم نہیں۔ اقبال کی شاعری حیرت و حسرت سے معمور ہے۔ یہ ایک مفکر اور مفسر کا کشکول ہے جس میں تحقیق و تخلیق کے انمول ہیرے پائے جاتے ہیں۔ اقبال کے تفکر

سے چشم پوشی قوم کی تباہی کا باعث ثابت ہو گی۔

اقبال کو صرف شاعر سمجھنا کج فہمی ہے۔ اقبال نے قومی اور ملی مقاصد کی تکمیل کے لیے شاعری کو نیا رنگ عطا کیا۔ عشق کی فتنہ گری، سرکشی اور چالاکی کو ایسا منفرد انداز میسر آیا کہ نالہ بے باک آسمان کو بھی چیر گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فکر اقبال پر تحقیقی اور تنقیدی بھی نگاہ ڈالی گئی۔ اس طرح اقبالیات کا دامن کشادہ ہوا، فکر اقبال کے نئے جوہر کھلے اور فکر اقبال کا دامن پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ اقبال کی فکر شعرا کے موضوعات کا حصہ بنی اور اقبال کے انداز میں شاعری کا رجحان پروان چڑھنے لگا۔ گم نام شعراء کی کاوشیں بھی اقبال سے منسوب ہونے لگیں جن میں فکری اور فنی خامیوں سے اقبال کی شخصیت پر سوالیہ نشان لگایا جانے لگا۔

جس شعر کے خالق سے تعارف نہ ہو اور موضوعات میں فکر اقبال سے ہم آہنگی پائی جاتی ہو اسے اقبال کے کھاتے میں ڈالا جانے لگا۔ پہلے تو اس حوالہ سے تعلیم یافتہ طبقے نے خاموشی اختیار کی مگر کب تک؟ جب یہ رویہ حد سے بڑھ گیا تو اہل قلم نے شعر میں موضوع کی مناسبت کے ساتھ فکری اور فنی خوبیوں کا بھی جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس طرح بہت سے اشعار سامنے آئے جو اقبال کے تھے ہی نہیں۔ آج جسے کوئی شعر پسند آتا ہے وہ اس کے سات اقبال کی تصویر لگا کر یا اقبال کا نام لکھ کر پوسٹ لگا دیتا ہے۔ پڑھنے والے تو بہت متاثر ہوتے ہیں۔ مگر اہل علم و دانش سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی گئی ہیں اقبال کے متروک کلام میں تین اشعار پائے جاتے ہیں جو کچھ یوں ہیں۔

کب ہنسا تھا کہ جو کہتے ہو کہ رونا ہو گا
ہو رہے گا میری قسمت میں جو ہونا ہو گا
خندۂ گل پہ مجھے آج تو ہنس لینے دو
پھر اسی بات پہ رو لوں گا جو رونا ہو گا
ہم کو اقبال مصیبت میں مزا ملتا ہے
ہم تو اس بات پہ ہنستے ہیں کہ رونا ہو گا(۸)

یہ اقبال کے طبع زاد اشعار نہیں۔ اقبال کے ایک ہم تخلص خواجہ غلام محمود اقبال بنارسی متوفی ۱۹۔ ستمبر ۱۹۴۹ء مقام ڈھاکہ کے ہیں۔ پروفیسر عبدالحق نے متن میں کچھ الفاظ میں تبدیلی کی نشان دہی کرتے ہوئے خواجہ غلام محمود اقبال بنارسی کی غزل کے مزید تین اشعار نقل کیے ہیں جو کچھ یوں ہیں۔

اک طرف دوست کا اصرار کہ آنکھیں کھولو
ایک طرف موت چمکتی ہے کہ سونا ہو گا
شوق سے آپ نقاب رخ زیبا الٹیں

ہو رہے گا میری قسمت میں جو ہونا ہو گا
ایسے دریا میں سلامت روی نوح کہاں
یار ہوتا ہے تو کشتی کو ڈبونا ہو گا(۹)

اقبال سے منسوب ایک شعر زبان زد عام ہے۔ مگر تحقیق سے ثابت ہوا کہ وہ بھی اقبال کا شعر نہیں ہے۔ شعر کچھ یوں ہے۔

تندی باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

یہ صادق حسین کاظمی (۱۸۹۸ء۔۱۹۸۹ء) کا شعر ہے اور ڈاکٹر صابر کلوروی لکھتے ہیں:

"یہ ایک طویل غزل کا شعر ہے جو گوجرانوالہ کے وکیل صادق صاحب کی تصنیف ہے۔"(۱۰)

ایک اور بہت مشہور شعر آپ نے سنا ہو گا۔

قسمت نوع بشر تبدیل ہوتی ہے یہاں
اک مقدس فرض کی تکمیل ہوتی ہے یہاں

یہ شعر بھی اقبال سے منسوب کیا گیا مگر یہ مضطر نظامی صاحب کا شعر ہے جو ۱۸ اگست ۱۹۰۹ء کو پسرور میں پیدا ہوئے۔ اسی طرح ایک مشہور قطعہ دیکھیے۔

جو حق سے کرے دور وہ تدبیر بھی فتنہ
اولاد بھی اجداد بھی جاگیر بھی فتنہ
ناحق کے لیے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ
شمشیر تو کیا نعرہ تکبیر بھی فتنہ

ان مصرعوں میں الفاظ، خیالات اور حجازی نے عوام کو مغالطے میں ڈال دیا اور اقبال کا سمجھ کر اس کی قرات خوانی شروع ہو گئی۔ یہ قطعہ اقبال کا نہیں بلکہ مادھوپور، ریاست راجستھان کے سرفراز احمد خان کا ہے جو سرفراز بزمی فلاحی کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ اجمیر یونیورسٹی، اجمیر سے ایم۔ اے انگریزی کیا۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں شعرائے راجستھان کے ایک انتخاب میں یہ شائع بھی ہوا تھا۔

اقبال نے یقین محکم اور عمل پیہم کا پیغام دیا۔ اپنے اشعار کو بھی ان مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ لہو گرم رکھنے کے بہانے متعارف کروائے۔ بحر کی موجوں میں اضطراب نہ ہو اس کے لیے طوفان سے آشنا ہوے کی نصیحت فرمائی۔

عوام نے جو بھی ایسا شعر سنا جس میں ہمت اور بہادری کا سبق ملتا ہو، اسے اقبال ہی سے منسوب کر دیا۔ یہ شعر آپ نے سنا ہو گا۔

ارادے جن کے پختہ ہوں، نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرا یا نہیں کرتے

یہ شعر اقبال کا نہیں مگر تقریروں میں لوگ اسے اقبال کا حوالہ دے کر ہی سناتے رہے حالانکہ کلیات اقبال اردو میں اس شعر کا کوئی وجود نہیں۔ میڈیا سے جو سہولتیں دستیاب ہیں ان کا مثبت استعمال بھی عقل و دانش کی دلیل ہے مگر اس سے جو کام لیا جا رہا ہے وہ اب بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے جس کا جی چاہتا ہے وہ اپنی مرضی کا شعر لکھ کر بھیجنا شروع کر دیتا ہے۔ اس تصدیق کے بغیر کہ وہ شعر اقبال کا ہے یا کسی اور شاعر کا ہے؟ بس کسی نہ کسی طرح اقبال سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ ذیل میں چند اشعار کی فہرست دی گئی ہے جو کسی نہ کسی طرح اقبال سے منسوب کیے گئے اور انہیں عام کرنے کا ہر حربہ استعمال بھی کیا گیا۔ اس کے لیے میڈیا کا سہارا لے کر اسے بدنام کرنے کی کوشش جاری ہے۔ ہمیں اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہوئے اس کا راستہ روکنا ہو گا تا کہ فکر اقبال اپنی صحیح صورت میں آئندہ نسلوں تک منتقل کی جا سکے۔

علامہ اقبال سے غلط طور پر منسوب چند اشعار:

ملا قاتیں عروج پر تھیں تو جواب اذاں تک نہ دیا اقبال
صنم جو روٹھا ہے تو آج مؤذن بنے بیٹھے ہیں

کلمہ یاد آتا ہے نہ دل لگتا ہے نمازوں میں اقبال
کافر بنا دیا ہے لوگوں کو دو دن کی محبت نے

کتنی عجیب ہے گناہوں کی جستجو اقبالؔ
نماز بھی جلدی میں پڑھتے ہیں پھر سے گناہ کرنے کے لیے

یہ پوری نظم غلط طور پر اقبال سے منسوب ہے۔

علامہ اقبال

منزل سے آگے بڑھ کر منزل تلاش کر
مل جائے تجھ کو دریا تو سمندر تلاش کر

ہر شیشہ ٹوٹ جاتا ہے پتھر کی چوٹ سے
پتھر ہی ٹو ٹ جا ئے وہ شیشہ تلاش کر
سجدوں سے تیرے کیا ہو ا صدیاں گزر گئیں
دنیا تیر ی بدل دے وہ سجدہ تلاش کر
ایمان تیرا لٹ گیا رہزن کے ہاتھوں سے
ایمان تیرا بچالے وہ رہبر تلا ش کر
ہر شخص جل رہا ہے عداوت کی آگ میں
اس آگ کو بجھادے وہ پانی تلاش کر
کرے سوار اونٹ پہ اپنے غلام کو
پیدل ہی خود چلے جو وہ آقا تلاش کر

بکھر جائیں گے ہم کیا جب تماشا ختم ہو گا
میرے معبود آخر کب تماشا ختم ہو گا
چراغ حجرہ درویش کی بجھتی ہوئی لو
ہوا سے کہہ گئی ہے اب تماشا ختم ہو گا
کہانی میں نئے کردار شامل ہوگئے ہیں
نہیں معلوم اب کسی ڈھب تماشا ختم ہو گا
کہانی آپ الجھی ہے کہ الجھائی گئے ہے
یہ عقدہ تب کھلے گا جب تماشا ختم ہو گا
زمین جب عدل سے بھر جائے گی نور علی نور
بنا م مسلک و مذہب تماشا ختم ہو گا

علامہ اقبال مقطعے کا کوئی خاص اہتمام نہ کرتے تھے اس غزل میں بھی مقطع نہیں ہے۔ اقبال سے نسبت دے کر تشہیر کا کام سرانجام دیا گیا ہے۔

چھوڑدے تسبیہ کو گن گن کے پڑھنا اقبالؔ
اس سے کیا حساب، جو بے حساب دیتا ہے

درج ذیل نظم باقاعدہ علامہ اقبال کی تصویر لگا کر اور سرخی دے کر عام کی گئی۔ حالانکہ علامہ اقبال سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

علامہ اقبال کی ایک خوبصورت نظم

کوئی عروج دے نہ زوال دے
مجھے صرف اتنا کمال دے
مجھے اپنی رہ میں ڈال دے
کہ زمانہ میری مثال دے
تیری رحمتوں کا نزول ہو
مجھے محنتوں کا صلہ ملے
مجھے مال وزر کی ہوس نہیں
مجھے بس تو رزق حلال دے
میرے ذہن میں تیر ی فکر ہو
میری سانس میں تیرا ذکر ہو

اس شعر کا بھی علامہ اقبال سے کوئی تعلق نہیں ہے:

یہ کفن، یہ قبر، یہ جنا زے، رسم شریعت ہے اقبال
مر تو انسان تب ہی جاتا ہے، جب یاد کرنے والا کوئی نہ ہو

(علامہ اقبال)

یہ شعر بھی غلط طور پر علامہ اقبال سے منسوب کر دیا گیا۔

اپنے کردار پہ ڈال کہ پردہ اقبال
ہر شخص کہہ رہا ہے زمانہ خراب ہے

(علامہ اقبال)

نوٹ:۔ اس شعر میں 'کہ' کا لفظ بھی انتہائی غلط تلفظ پیش کر رہا ہے۔

وہ پتھروں سے مانگتے ہیں اپنی مرادیں، اقبال
ہم ان کے امتی ہیں، جس کو دیکھ کر پتھر بھی کلمہ پڑھتے
(علامہ اقبال)

بستر سے اٹھ کر مسجد تک جا نہ سکے اقبال
خواہش رکھتے ہیں، قبر سے اٹھ کر جنت جانے کی
(علامہ اقبال)

ان میں اشعار کی ہو بہو وہی صورت پیش کی گئی ہے جیسے واٹس ایپ گروپ میں، فیس بک پر یا کسی بھی شکل میں موصول ہوئے ہیں۔ باقاعدہ علامہ اقبال کی تصویر لگا کر اور نام لکھ کر ثابت کہا گیا ہے۔ کہ یہ علامہ اقبال ہی کا شعر ہے۔ اشعار، منظومات اور اقبال کو غلط طور پر علامہ اقبال سے منسوب کر لینا علمی کے باعث ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کئی وجوہات بھی ہیں۔ شیخ عبد القادر جب "مخزن" نکالتے تھے تو اقبال اس میں اشاعت کے لیے اپنے پسندیدہ منتخب اشعار بھجواتے تھے۔ وہ اقبال کے نہ ہوتے تھے۔ اس طرح کے اشعار کچکول کے عنوان سے شائع ہوتے۔ منتخب شعر کے دائیں جانب شعر بھیجنے والے کا نام لکھا جاتا اور بائیں جانب شاعر کا نام۔ اقبال نے بھی درج ذیل اشعار بھیجے جو شائع ہوئے۔

حشر کو جانتا ہوں بن دیکھے
ہائے ہنگامہ اس کی محفل کا
سدرہ گرچہ تھی صعوبت راہ
لے اڑا اشتیاق منزل کا
تھی غضب طرز پرسش ہمدرد
لب پہ آیا ہے مدعا دل کا

ڈاکٹر گیان چند نے اپنی تحقیق کے مطابق لکھا۔

"یہ غزل روزگار ص ۳۰۲۔۳۰۶ اور باقیات ص ۴۴۹ پر ہے اس کا زمانہ معلوم نہیں۔
اس کے رنگ کو دیکھتے ہوئے اندازاً یہاں رکھ دی گئی ہے۔"(۱۱)

ڈاکٹر صابر کلوروی نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا تو واضح ہوا کہ یہ اشعار اقبال کے نہیں ہیں۔ شاعر کا نام اور مخزن کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے لکھا:

"مخزن دسمبر ۱۹۰۱ء کے اس شمارے میں جہاں یہ کلام پہلی بار چھپا علامہ کا نام دائیں

طرف درج ہے جبکہ شاعر کا نام بائیں طرف درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ
اشعار دراصل امراؤ مرزا انور دہلوی کے تھے جو اقبال کو پسند آئے۔"(۱۲)

آغا حشر کاشمیری کی ایک نظم بھی اقبال سے منسوب ہوئی۔ اس کا ایک شعر ہے۔

آہ جانی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلوں ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے

اس نظم کا انداز شکوہ، جواب شکوہ سے ملتا جلتا تھا اس لیے یہ بھی علامہ اقبال سے منسوب رہی۔

اقبال سے منسوب اشعار کی روایت دیرینہ ہے مگر عصرِ حاضر میں یہ بات انتہائی تکلیف دہ حد تک بڑھ چکی ہے کہ نامناسب اور غیر موزوں اشعار بھی اقبال سے منسوب کیے جا رہے ہیں۔ تحقیق، تنقید اور فلسفہ میں قطعیت کسی بھی چیز کو حاصل نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحقیقی نتائج میں بھی تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔ زمانِ ماضی کے نتائج عصرِ رواں میں تبدیل ہوتے ہی رہے ہیں اور مستقبل میں بھی نئے نتائج کی توقع رکھنی چاہیے۔ محققین نے جو تحقیقی کام سر انجام دیا تھا اس سے کچھ غلط اشعار علامہ اقبال سے منسوب ہوئے مگر تحقیق کے بعد ان اشعار کو فکرِ اقبال سے خارج کر دیا گیا۔ آج بھی عوام کو تحقیقی رویہ اختیار کرتے ہوئے علامہ اقبال کے اشعار کو اچھی طرح غور سے پڑھنا چاہیے اور اس کی تصدیق کر لینی چاہیے۔ اگر کسی نے فارسی شعر کا اردو میں ترجمہ لکھا ہو تو اسے یہ بات بھی واضح کرنی چاہیے کہ یہ ترجمہ ہے۔ علامہ اقبال کے ساتھ بہت بڑا ظلم یہ بھی ہو رہا ہے کہ ان کی آواز کی ریکارڈنگ سنا کر عوام کو گمراہ کیا جاتا ہے۔ اس حوالہ سے پسر زادۂ اقبال جناب منیب اقبال صاحب سختی سے تردید بھی کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال کی کوئی ریکارڈنگ دستیاب نہیں ہے۔ ہمیں تحقیقی رویوں کو پروان چڑھانا ہو گا۔ تاکہ علامہ اقبال سے غلط طور پر منسوب اشعار کو رد کیا جا سکے۔ صرف علامہ اقبال سے عقیدت کی بنیاد پر ہر شعر علامہ اقبال کا نہ قرار دیا جائے۔ اس مضمون کا مطالعہ تحقیق اور تصدیق کا رجحان پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو گا۔ اس سے اقبالیات کے میدان میں تحقیق اور تصدیق کا دامن کشادہ ہو گا۔ اقبالیات کے طلبا تحقیق و تنقید کی نئی راہوں پر گامزن ہوں گے اور فکرِ اقبال کے دامن میں سچائی کے پھول سجیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، لاہور: مجلس ترقی اردو، طبع سوم ۱۹۹۴ء، ص:۵۷۳

۲۔ انور سدیدہ، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، دہلی: عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۱۴ء، ص:۱۵۲

۳۔ انور سدیدہ، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص:۱۹۵

۴۔ عبدالحق، پروفیسر، اقبال اور اقبالیات، اقبال کی غالب شناسی، سرینگر: بٹہ مالو، میزان پبلشرز (رجسٹرڈ) متصل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز، ہیڈ کوارٹرس، باردوم، ۲۰۰۹ء، ص:۶۷

۵۔ عبدالحق، پروفیسر، اقبال اور اقبالیات، اقبال کی غالب شناسی، ص:۷۶

۶۔ عبدالحق، پروفیسر، اقبال-شاعرِ رنگیں نوا، نئی دہلی: اصیلا پریس، دریا گنج، مئی ۲۰۰۹ء، ص:۸۸

۷۔ محمد حیات خاں سیال، پروفیسر، شمیم اختر سیال، پروفیسر، مرتبین، ہمارے نثر نگار اور شاعر، لاہور: الائیڈ بک سنٹر اردو بازار، نیا ایڈیشن ۱۲-۲۰۱۱ء ص:۱۴۱

۸۔ اقبال، کلیاتِ باقیاتِ شعر اقبال، متروک کلامِ اقبال، مرتبہ، ڈاکٹر صابر کلوروی، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص:۲۶۵

۹۔ عبدالحق، پروفیسر، اقبال اور اقبالیات، ص:۱۱۹

۱۰۔ اقبال، کلیاتِ باقیاتِ شعر اقبال، مرتبہ، ڈاکٹر صابر کلوروی، ص:۵۵۳

۱۱۔ گیان چند، ڈاکٹر، ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیب مہ وسال، دہلی ۶: فوٹو آفسیٹ پرنٹرس بارہ دری، شیر افگن، بلی ماران، ۱۹۸۸ء، ص:۲۰۷

۱۲۔ اقبال، کلیاتِ باقیاتِ شعر اقبال، مرتبہ، ڈاکٹر صابر کلوروی، ص:۵۵۲